درس ۷

’اطاعتِ امر‘

بمقابلہ

’تنازُع فی الامر‘

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بَعدُ :

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ...... بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِکَ خَیۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ﴿۵۹﴾﴾ (النساء)

﴿وَاَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡهَبَ رِیۡحُکُمۡ وَاصۡبِرُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۴۶﴾﴾ (الانفال)

﴿وَلَقَدۡ صَدَقَکُمُ اللّٰهُ وَعۡدَهٗۤ اِذۡ تَحُسُّوۡنَهُمۡ بِاِذۡنِهٖ ۚ حَتّٰۤی اِذَا فَشِلۡتُمۡ وَتَنَازَعۡتُمۡ فِی الۡاَمۡرِ وَعَصَیۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَرٰىکُمۡ مَّا تُحِبُّوۡنَ ؕ مِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الدُّنۡیَا وَمِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الۡاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَکُمۡ عَنۡهُمۡ لِیَبۡتَلِیَکُمۡ ۚ وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡکُمۡ ؕ وَاللّٰهُ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۵۲﴾﴾ (آل عمران)

﴿یَقُوۡلُوۡنَ هَلۡ لَّنَا مِنَ الۡاَمۡرِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡاَمۡرَ کُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ﴾ (آل عمران:۱۵۴)

﴿قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا عَلَیۡهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَیۡکُمۡ مَّا حُمِّلۡتُمۡ ؕ وَاِنۡ تُطِیۡعُوۡهُ تَهۡتَدُوۡا ؕ وَمَا عَلَی الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ ﴿۵۴﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ ۪ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَهُمۡ دِیۡنَهُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَهُمۡ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِهِمۡ اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا ؕ وَمَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۵۵﴾ وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۵۶﴾﴾ (النور)

اس سے ماقبل اسباق میں جو باتیں بالکل دو اور دو چار کی طرح واضح ہو کر ہمارے سامنے آ چکی ہیں ان میں اوّلین بات ’’فرائضِ دینی کا جامع تصور‘‘ سے متعلق ہے کہ فرائض دینی کی چوٹی کیا ہے۔ اسے خواہ اقامت دین کہہ لیا جائے‘ خواہ تکبیر ربّ کہہ لیا جائے‘ خواہ غلبۂ دینِ حق یا اعلائے کلمۃ اللہ کہہ لیا جائے‘ خواہ زمین پر آسمانی بادشاہت کا قیام کہہ لیا جائے‘ خواہ قیامِ حکومت الٰہیہ کا نام دے دیا جائے‘ خواہ اسے قیامِ نظامِ اسلامی سے تعبیر کر لیا جائے‘ خواہ نفاذِ نظامِ مصطفیٰ ﷺ سے تعبیر کیا جائے‘ خواہ اسلامی انقلاب کہہ لیا جائے‘ یہ عبارات مختلف ہیں‘ اصطلاحات جدا ہیں‘ لیکن بات ایک ہی ہے۔

قرآن وسنت کی روشنی میں سمع وطاعت کا تصور

دوسری بات ہم نے ماقبل اسباق میں یہ سمجھی تھی کہ یہ کام بغیر ایک منظّم جماعت کے ممکن نہیں۔ یعنی صرف جماعت ہی نہیں بلکہ اس کے لیے ایک منظّم (disciplined) جماعت کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے قرآن وسنت کی اصطلاح ’’سمع وطاعت‘‘ ہے: وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِیۡعُوۡا ’’سنو اور (بلا چون وچرا) اطاعت کرو‘‘۔ یہ اصطلاح ہمارے منتخب

نصاب (۱) میں سورۃ التغابن کے آخر میں بایں الفاظ ذکر ہوئی ہے: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ ''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اپنے امکان کی حد تک'' تاحدِّ استطاعت۔ اللہ کا تقویٰ تو دین کی روح ہے۔ اور اس کا جو نظام بنے گا وہ ہو گا سمع وطاعت کا نظام کہ ﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا﴾ ''سنو اور بس اطاعت کرو'' اور اس کے لیے انفاق کی ضرورت ہے۔ یہ تینوں چیزیں سورۃ التغابن میں ایک ساتھ ذکر ہوئی ہیں کہ ﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا﴾ ''اور (التزام کے ساتھ) سنو اور (بلا چون و چرا) اطاعت کرو اور انفاق کرو''۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ انفاق دو طرح کا ہے' انفاقِ مال اور بذلِ نفس۔ یہ بات سورۃ الحدید کی ابتدائی آیات میں واضح ہو جاتی ہے۔ تو اب بات گویا پوری طرح کھل کر سامنے آ گئی کہ روحِ دین اللہ کا تقویٰ ہے اور نظامِ دین سمع وطاعت ہے اور اس نظام کے تحت انفاقِ مال اور بذلِ نفس مطلوب ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو اس حدیث نبویؐ میں مذکور ہے جو حضرت حارث اشعریؓ سے مروی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''مسلمانو! میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: التزامِ جماعت' سمع وطاعت' ہجرت اور جہاد''۔

نوٹ کیجیے کہ اس میں تیسری بات ''اطاعت'' ہے اور ہم یہ بات پوری تفصیل سے سمجھ چکے ہیں کہ اس کے لیے بیعت کا نظام لازم ہے' جو قرآن وسنت سے منصوص اور مأثور ہے اور یہ نظامِ بیعت ہماری پوری تاریخ میں معمول بہ رہا ہے۔ ہر اجتماعیت اسی کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ ڈھیلی سے ڈھیلی اجتماعیت بھی جو خالص انفرادی اصلاح کے عنوان سے قائم ہوئی' وہ بھی بیعت کے عنوان سے قائم ہوئی' حکومت بنی تو بیعت کے تحت بنی' حکومت سے بغاوت کی نوبت آئی تو بیعت کی بنیاد پر آئی۔ ہماری پوری تاریخ میں یہی نظر آتا ہے' لہٰذا اس کا نظام' نظامِ بیعتِ سمع وطاعت ہے۔ یہ بیعتِ سمع وطاعت حضور ﷺ اور دیگر انبیاء ورُسل کے لیے مطلق' غیر مشروط اور غیر مقید ہے' لیکن حضور ﷺ کے بعد ہر شخص کے لیے' خواہ وہ خلافتِ راشدہ تھی خواہ بیعتِ ارشاد ہو' فی المعروف کی شرط کے ساتھ مقید ہے۔ اس کے سوا اس نظامِ اطاعت کے حوالے سے کوئی فرق نہیں۔ البتہ ایک اور پہلو سے اس میں ایک فرق ہے' جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے' تاکہ اس کی اہمیت بھی سامنے آ جائے اور اس کا صغریٰ کبریٰ بھی پورے طور سے واضح ہو جائے' اور اس طرح سے انشراحِ صدر ہو جائے۔

اس کے ضمن میں سب سے پہلی آیت جو ہم نے منتخب کی' وہ سورۃ النساء کی آیت ۵۹ ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ﴾ ''اے اہل ایمان! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اُس کے رسول کی اور اپنے میں سے اصحابِ امر کی''۔ بیعت کے سلسلے میں جو حدیث ہم تفصیل سے پڑھ چکے ہیں اس میں الفاظ آئے ہیں: '' وَعَلٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ '' کہ ہم نہیں جھگڑیں گے اصحابِ امر سے' چاہے جو بھی امیر ہو۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ امارت کا ایک باقاعدہ سلسلہ ہوتا ہے۔ ایک ہی شخص امیر نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ مسلمانوں کے امیر مطلق تھے۔ پھر آپؐ کہیں کوئی جیش بھیجتے تھے تو کسی کو اس کا امیر بناتے تھے۔ پھر اس جیش میں بھی کوئی ایک امیر نہیں ہوتا تھا' اس کے تابع مختلف دستوں کے کمانڈر ہوتے تھے۔ یعنی کوئی میمنہ پر امیر ہے تو کوئی میسرہ پر' کوئی قلب پر امیر مقرر کیا گیا ہے تو کوئی ہراول دستے پر۔ اسی طرح کوئی پیچھے محفوظ فوجوں (Reserved Forces) پر امیر ہے۔ پھر فوج کے مختلف حصوں کی مزید تقسیم بھی ہو سکتی ہے۔ میمنہ اور میسرہ کے اندر بہت سے دستے اور ان کے الگ الگ کمانڈر ہو سکتے ہیں۔ تو یہ تو ایک سلسلہ ہے' اس لیے ''اولی الامر'' کو جمع کی صورت میں لایا گیا ہے۔

مزید نوٹ کیجیے کہ یہاں اطاعت کی جو تین کڑیاں ہیں' اللہ کی اطاعت' رسول کی اطاعت اور اولی الامر کی اطاعت' ان میں سے پہلی دو کڑیوں کے ساتھ تو فعل امر ''اَطِيْعُوْا'' کی تکرار ہوئی' لیکن تیسری کڑی کے ساتھ نہیں ہوئی۔ ورنہ عام ذہن چاہتا ہے کہ یا تو ایک ہی مرتبہ اَطِيْعُوْا کا لفظ کافی ہے' کیونکہ بریکٹ کے باہر والی قدر بریکٹ کے اندر موجود تمام اقدار سے ضرب کھاتی ہے۔ یا پھر اگر تکرار کی گئی تھی تو ایک لفظ کے اضافے سے کوئی حرج نہیں تھا کہ اولی الامر کے ساتھ بھی لفظ ''اَطِيْعُوْا'' دہرا دیا جاتا۔ لیکن نہیں' جو کچھ ہوا بالحق ہوا' اللہ کی حکمت کی بنیاد پر ہوا۔ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت تو مطلق ہے' جب کہ اولی الامر کی اطاعت مقید اور مشروط ہے اور پہلی دو اطاعتوں کے تابع ہے۔ لہٰذا پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہیے جو ان الفاظ کی ترکیب کے اندر مضمر اور مقدر (understood) ہے۔

اب ذرا توجہ کو لفظ اطاعت پر مرکوز کیجیے! اس کا مادہ ''طوع'' ہے اور طوع بمقابلہ ''کرہ'' کے آتا ہے' جیسے طوعاً وکرہاً عام مستعمل ہے۔ اطاعت کہتے ہیں دلی آمادگی سے کسی کی بات ماننے کو۔ یہی اصل میں مطلوب ہے۔ اگرچہ حدیث میں جو بیعت کے الفاظ ہیں ان میں ساتھ ہی اضافہ کر دیا گیا کہ اگر بطوعِ خاطر ہے فبہا' ورنہ اگر کرہاً ہے تو بھی کرنی پڑے گی۔ حدیث کے الفاظ ہیں: بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ یعنی چاہے تمہیں کوئی چیز ناپسند ہو' تمہارے بارِ خاطر ہو' تمہاری رائے اس کے حق میں نہ ہو' لیکن چونکہ فیصلہ ہو گیا ہے' صاحبِ امر نے طے کر دیا ہے اور آپ اسے خلافِ دین ہونا یا شریعت کے کسی واضح حکم کے مخالف ہونا بھی ثابت نہیں کر سکے تو آپ کو وہ فیصلہ ماننا پڑے گا۔ اگرچہ جماعتی نظم میں جو روح درکار ہے' جس سے کامیابی کی ضمانت ہو گی' وہ تو یہ ہے کہ جماعت کی اصل ریڑھ کی ہڈی کے اندر یہ اطاعت اپنی اصل روح کے ساتھ یعنی بطوعِ خاطر ہو رہی ہو۔

اب اس میں جو اصل بات ہے، جسے میں چاہتا ہوں کہ آپ پورے شرح وبسط کے ساتھ سمجھ لیں، وہ یہ ہے کہ اولی الامر کے ساتھ شرط ہے مِنۡکُمۡ کی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ اولی الامر مسلمان ہونے چاہئیں۔ اب اگر کہیں غیر مسلم زبردستی قابض ہو جائے تو مجبوراً اور اضطراراً تو اس کی اطاعت کی جا سکتی ہے، جیسے بھوک سے مرتا انسان سُؤر یا مردار کھا سکتا ہے، جیسے فرمایا گیا: ﴿فَمَنِ اضۡطُرَّ غَیۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۷۳) (پس جو حالت مجبوری میں ہو تو اس پر [یہ ناپاک چیز کھانے میں] کوئی گناہ نہیں، بشرطیکہ [اس کے کھانے میں] کوئی سرکشی اور حد سے تجاوز نہ ہو)۔ ورنہ اسلام میں اصلاً غیر مسلم کی اطاعت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ اس اعتبار سے کراچی کا مقدمۂ بغاوت ہماری گزشتہ دو سو سالہ تاریخ کے اندر روشنی کا ایک عظیم مینار ہے، جہاں ہماری تین عظیم شخصیتوں نے انگریز کی عدالت میں برملا تسلیم کیا کہ ہاں ہم باغی ہیں اور مسلمان کسی غیر مسلم حکومت کا وفادار نہیں ہے۔

اولوالامر سے اختلاف کی صورت میں لائحہ عمل

اب آپ ایک بات اور سمجھئے کہ یہ نظامِ اطاعت دو طرح کا ممکن ہے۔ ان دونوں کے ضمن میں حکم ہو رہا ہے کہ: ﴿فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ﴾ یعنی اگر تم کسی چیز کے معاملے میں اختلافِ رائے کا شکار ہو جاؤ، تمہارے مابین کسی معاملے میں تنازُع ہو جائے تو اسے لوٹا دو اللہ اور اس کے رسول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور آخرت کے دن پر۔ اب دیکھئے تنازُع کسے کہتے ہیں۔ یہ نزع سے بابِ تفاعل ہے۔ نزع کے معنی ہیں کھینچنا۔ جب جان کھینچی جائے گی تو وہ عالمِ نزع ہے۔ لہٰذا تنازُع کے معنی ہیں کھینچ تان۔ اگر ایک طرف سے ایک کھینچ رہا ہے اور دوسری طرف سے کوئی دوسرا کھینچ رہا ہے تو یہ تفاعل کے وزن پر تنازُع ہے۔ بابِ مفاعلہ کی طرح بابِ تفاعل کے بھی دو خواص مبالغہ اور مشارکہ ہیں۔ یعنی شرکت بھی ہوتی ہے اور مبالغہ بھی ہوتا ہے۔

تو اس آیت میں اسی بات کی طرف راہنمائی کی جا رہی ہے کہ اگر تمہارے مابین یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو اب کیا کرنا ہے! یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کی رائے ہو کہ یہ چیز صحیح ہے اور دوسرے کی رائے ہو کہ نہیں، یہ غلط ہے۔ اب یہاں نوٹ کیجیے کہ میں نے 'صحیح' اور 'غلط' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ صحیح اور غلط کے مختلف درجات ہیں۔ ایک معاملہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ ایک کی رائے ہے کہ یہ چیز اَنسب ہے، زیادہ مناسب ہے اور ایک کی رائے ہے کہ یہ کم مناسب ہے۔ معاملہ نصوص کا نہ ہو، حلال وحرام کا نہ ہو، بلکہ صرف تدبیر کا ہو کہ بحالاتِ موجودہ ہمارے لیے کون سا طریقۂ کار موزوں تر ہے؟ ابھی ہم کوئی مزید قدم اٹھانے کی پوزیشن میں ہیں یا نہیں ہیں؟ ایک کا خیال ہو سکتا ہے کہ ہیں اور ایک کا خیال ہو سکتا ہے کہ نہیں ہیں۔ اس بحث کو ایک طرف رکھ دیجیے! یہاں معاملہ نصوص کا ہے۔ جو معاملات اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مطلق اطاعت سے متعلق ہوں، یعنی حلال وحرام، جائز و ناجائز اور صحیح وغلط میں اگر اختلافِ رائے ہو جائے اور تنازُع پیدا ہو جائے۔ یہاں وہ حدیث ذہن میں لے آیئے کہ ((اِنَّ الۡحَلَالَ بَیِّنٌ وَاِنَّ الۡحَرَامَ بَیِّنٌ وَبَیۡنَھُمَا مُشۡتَبِھَاتٌ))(۱) ''حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، البتہ ان دونوں کے مابین کچھ چیزیں مشتبہ (غیر واضح) ہیں''۔ دین میں جو قطعی حلال وحرام ہیں وہ تو بالکل بیّن ہیں۔ البتہ ان کے مابین مشتبہات کا دائرہ آ جاتا ہے جہاں اصل میں مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ مشتبہات میں بھی آدمی کی رائے میں سختی ہو سکتی ہے۔ کوئی یہ سمجھتا ہے کہ یہ چیز حرام سے زیادہ قریب ہے اور کسی دوسرے کی رائے میں یہی چیز حلال سے زیادہ قریب ہے تو دونوں اپنی اپنی رائے پر جازم ہو جائیں گے اور ان کی آراء میں سختی پیدا ہو جائے گی۔ اس کیفیت کو ذہن میں رکھئے! اس کا حکم یہ دیا کہ: ﴿فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ﴾ ''لوٹا دو اُس شے کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف''۔ یہ بالکل منطقی سی بات ہے۔ اس لیے کہ غیر مقید، غیر مشروط اور مطلق اطاعت تو صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی ہے۔

اب دیکھئے، نظم جماعت کی دو علیحدہ علیحدہ شکلیں ہیں، جنہیں سمجھ لینا چاہیے۔ ایک معاملہ ہو سکتا ہے کسی اسلامی ریاست میں حکومت کے ساتھ اس جھگڑے کے پیش آ جانے کا۔ ہم سورۃ الحجرات میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں کہ اسلامی ریاست کا اصل الاصول یہ آیۂ کریمہ ہے: ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ﴾ (آیت ۱) ''اے اہل ایمان! اللہ اور اس کے رسول سے آگے مت بڑھو!'' کیونکہ قرآن وسنت ہی اس کا دستورِ اساسی ہے اور اہل ایمان کے پاس جو بھی قانون سازی کا اختیار ہے وہ ایک دائرے کے اندر محدود ہے۔ چنانچہ پاکستان کے دستور میں بھی یہ شق موجود ہے کہ:

"No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah."

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ریاست کا ایک شہری اگر یہ محسوس کرتا ہے کہ جو مسودۂ قانون اس وقت زیر بحث ہے اس کی کوئی شق یا وہ پورا قانون شریعت کے دائرے سے تجاوز کر رہا ہے، یا یہ کہ جو قانون اس وقت ریاست میں موجود ہے، اس کی رائے کے مطابق (چاہے اس کی رائے صحیح ہو یا غلط) اس میں اللہ اور اس کے رسول کے دائرے سے تجاوز ہے، تو اس صورت میں اس کا کیا حل ہو گا؟ اس کی وضاحت تفصیلاً ہو چکی ہے کہ الحمد للہ، ثم الحمد للہ کہ اس دَور میں جو ادارے (institutions) وجود میں آئے ہیں اور جو عمرانی ارتقاء ہوا ہے اس نے ریاست کے تین بنیادی اعضاء (organs) کو علیحدہ علیحدہ متعارف کرایا ہے۔ ایک قانون ساز ادارہ (Legislature) ہے، ایک انتظامیہ

(Executive) ہے اور ایک عدلیہ (Judiciary) ہے۔ تو یہ معاملہ عدالت کے حوالے ہو گا۔ جیسے دستور کی جو دوسری provisions ہیں‘ ان سب کی امین (custodian) عدلیہ ہے۔ مثلاً اگر کسی کے بنیادی حقوق میں کمی کی گئی ہے تو وہ کہاں جائیں گے! عدالت ہی کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ اسی طرح جب ریاست کے دستورِ اساسی میں یہ طے ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی تو اختلاف کی صورت میں آپ عدالت ہی کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ آپ کے خیال میں اگر کوئی عمل قرآن وسنت کے خلاف ہورہا ہے‘ ممکن ہے آپ کو مغالطہ ہو‘ لیکن یہ کہ آپ کے لیے راستہ تو یہی ہے کہ جو بھی اعلیٰ عدالتیں ہیں ان کا دروازہ کھٹکھٹائیں! وہاں علماء کو بھی بحث اور استدلال کا موقع ہے کہ وہ عدالت میں جائیں اور دلائل دے کر ثابت کریں کہ یہ صرف مغالطہ تھا یا بات واقعی صحیح تھی۔ یہ ہے صورت جو اسلامی ریاست کے اندر اِس دَور میں اختیار کی جائے گی۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ نبی اکرم ﷺ کے اندر تو دیگر ہزاروں حیثیتوں کے ساتھ یہ تینوں حیثیتیں بھی جمع تھیں۔ صدرِ ریاست ہونے کے ساتھ ساتھ حضور ﷺ ہی چیف جسٹس بھی تھے‘ حضور ﷺ ہی چیف ایگزیکٹو بھی تھے اور قانون سازی بھی حضور ﷺ ہی کے ہاتھ میں تھی۔ آپؐ تو خود شارع ہیں۔ شارع اوّل اللہ تعالیٰ اور شارع ثانی محمدٌ رسول اللہ ﷺ۔ تو یہ تینوں حیثیتیں حضور ﷺ کی ذات میں جمع تھیں۔ اسی کا عکس آپ کو خلافت راشدہ میں نظر آئے گا‘ اگرچہ ذرا آگے چل کر اس میں تقسیم شروع ہوئی ہے۔ غالباً حضرت عمرؓ کے زمانے میں علیحدہ عدالتی نظام قائم ہوا ہے‘ ورنہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں کوئی علیحدہ عدالتی نظام نہیں تھا اور خلیفۂ وقت چیف جسٹس بھی تھا۔ ان چیزوں کے بارے میں لوگوں کو مغالطے لاحق ہوگئے ہیں۔ وہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ کیفیت ہمیشہ کے لیے واجب العمل (binding) ہے اور وہ تمدنی ارتقاء کو نظرانداز کر گئے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں بڑے بڑے لوگوں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ نظامِ خلافت راشدہ دراصل نظامِ دورِ نبوت کا تتمہ اور اس کا عکس ہے اور یہ حیثیت آئندہ کسی بھی نظامِ حکومت کو حاصل نہیں ہوسکتی‘ اس لیے کہ حضور ﷺ نے اس کے نظائر کو ہمارے لیے binding قرار دے دیا ہے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ))(۱) ’’پس تم پر لازم ہے کہ میرا طریقہ اور ہدایت یافتہ خلفاءِ راشدین کا طریقہ اختیار کرو‘‘۔ اب کسی اعلیٰ سے اعلیٰ اسلامی حکومت کا بھی تا قیامِ قیامت یہ مقام نہیں ہوگا۔ خلافت راشدہ تو اصل میں تتمہ اور نمونہ ہے دورِ نبوت کا۔ بہرحال یہ اولی الامر کا معاملہ اس طور سے اسلامی ریاست میں حل ہوگا۔

نظمِ جماعت کی دوسری صورت ایک اسلامی جماعت کی ہے۔ بالفرض ریاست قائم نہیں ہے اور اس کے قیام کی جدوجہد کے لیے ایک جماعت قائم ہوئی ہے تو اس میں جو اولی الامر ہوں گے ان کے ساتھ معاملہ کس طور سے ہوگا؟ اب اس میں بھی دیکھئے کہ ایک تو وہ شخص ہے جس کے ہاتھ پر آپ نے بیعت کی ہے۔ وہ آپ کا امیرِ اوّل ہے‘ وہ داعیٔ اوّل ہے۔ اس نے پکارا ہے مَنْ اَنْصَارِيْ اِلَى اللّٰهِ۔ آپ اس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے جمع ہوگئے۔ اس کے ہاتھ پر آپ نے بیعت سمع وطاعت فی المعروف کی ہے۔ اب اس کے نیچے امراء کا ایک نظام ہے اور امراء کی ایک لمبی زنجیر ہے۔ جتنی بڑی وہ جماعت ہوگی اور اس جماعت کا جتنا پھیلاؤ ہوگا اتنی ہی وہ لمبی زنجیر بنتی چلی جائے گی۔ اب یہاں پر اگر تدبیر کے معاملے میں آپ کا کوئی اختلاف ہوگا تو آپ صرف اپنی رائے پیش کر کے آزاد ہوجائیں گے۔ اب اس پر جو فیصلہ صاحب امر کرے گا آپ کو اسے تسلیم کرنا ہوگا‘ چاہے آپ اسے فِي الْمَنْشَطِ قبول کریں اور چاہے فِي الْمَكْرَهِ۔ اب یہاں تک تو کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا۔ مسئلہ اس وقت پیدا ہوگا جب ایک شخص کا خیال ہو کہ یہ تو شریعت کی حدود سے تجاوز ہورہا ہے۔ اب اس صورت میں یہ ہوگا کہ اگر تو یہ زیریں اطاعتیں ہیں‘ یعنی اصحابِ امر امیرِ اوّل سے نیچے والے ہیں تو آپ کو ایک لائن آف اپیل میسر ہے۔ آپ اس امیر سے بالاتر امیر کے پاس اپیل کریں گے۔ اور اگر آپ کو اس سے بھی اختلاف ہے تو اس سے بالاتر کے پاس جائیں گے۔ آپ کو through proper channel اس بات کو امیرِ اوّل تک پہنچانا ہوگا۔ اس میں کوئی شخص اپنے آپ کو آخری فیصلہ کرنے والا متصور نہ کرے۔ فرض کیجیے کہ بات آخری امیر یعنی امیرِ اوّل تک پہنچ گئی اور آپ اس کی ذات سے بھی مطمئن نہیں ہوئے تو آپ کے لیے راستہ بالکل کھلا ہوگا کہ آپ اس سمع وطاعت کی بیعت کا قلادہ گردن سے نکال کر پھینک دیں۔

ریاست اور جماعت میں یہی بنیادی فرق ہے کہ ریاست کی علاقائی حد بندی (territorial jurisdiction) ہوتی ہے‘ آپ اس سے نکل کر کہیں نہیں جاسکتے۔ یہاں جو بھی نظام قائم ہے آپ طوعاً یا کرہاً اس کے رکن ہیں‘ جب کہ جماعت کا کوئی علاقائی تسلط نہیں ہوتا۔ آپ فوراً ہی جماعت سے الگ ہوسکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو نہ شہر اور گاؤں چھوڑنا پڑتا ہے اور نہ ملک چھوڑنا پڑتا ہے۔ آپ نے جماعت کا ایک نظم اختیار کیا تھا جو ایک معنوی نظم ہے‘ علاقائی نظم نہیں ہے۔ کسی شخص کی اصابتِ رائے پر آپ کو اعتماد ہوا تھا تو آپ فکری ہم آہنگی کی بنا پر جماعت میں شامل ہوئے تھے‘ کسی شخص کے خلوص واخلاص پر آپ کے دل نے گواہی دی تھی اور اُس کی عزیمت اور ہمت پر آپ کو اعتماد ہوا تھا تو آپ شامل ہوئے تھے۔ اگر آپ کے نزدیک اب ان میں سے کوئی چیز نہیں رہی تو آپ کے لیے راستہ کھلا ہے‘ آپ آنِ واحد میں علیحدہ ہوسکتے ہیں۔ یہ ہے اصل فرق جسے لوگ نہیں سمجھتے۔ یعنی ریاست کے ضمن میں فیصلے کے لیے عدلیہ سے رجوع کیا جائے گا۔ اور جماعت میں امکان بھر کوشش کیجیے کہ اس بات کو معین طریق کار کے ذریعے آگے تک پہنچایئے! لیکن بہرحال کہیں نہ کہیں جا کر تو بات رُکے گی! کہیں پر جا کر تو وہ زنجیر بند ہوگی اور بات آخری امیر تک پہنچے گی! لہٰذا وہاں جا کر آدمی کو فیصلہ کرنا پڑے گا کہ اگر اس کا

دل مطمئن نہیں ہے تو وہ کیسے چل سکتا ہے! تدبیر کے معاملے میں اگر دل مطمئن نہیں ہے تو اس کو چلنا چاہیے۔لیکن اگر نصوص کے بارے میں دل مطمئن نہیں رہا تو اب اس کا چلنا ضروری نہیں ہے۔ وہ اس اطاعت کے قلادے کو اتار پھینکے۔اس کے لیے یہ راستہ کھلا ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا:﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۵۹﴾﴾ ''یہی بہتر ہے اور انجامِ کار کے اعتبار سے صحیح طریقہ ہے''۔اس میں لفظ ''تاَ ویل'' کا مفہوم سمجھ لیجیے۔الَ' یَـــؤُوْلُ کا مطلب ہے کسی چیز' کسی مرکز کی طرف لوٹنا۔اسی سے لفظ آل بنا ہے جس میں ایسے تمام لوگ ہوتے ہیں جو کسی بڑی شخصیت کی طرف اپنی نسبت کریں' اپنے آپ کو اس سے جوڑیں' اس سے تعلق قائم کریں' کسی معاملے میں اس کی طرف رجوع کریں۔ وہ سب گویا اس کی آل ہیں۔اس معنی میں ''آلِ محمدؐ'' پوری اُمت ہے۔ جو بھی حقیقت کے اعتبار سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جڑا ہوا ہے وہ آپ ﷺ کی آل میں شامل ہے۔تو الَ' یَؤُوْلُ کے باب تفعیل میں تاَ ویل بنا ہے جس کے معنی ہیں لوٹانا' کسی چیز کو رجوع کرانا۔ یعنی اگر اپنی جدوجہد کو کامیابی اور نتیجہ خیزی کی طرف لوٹانا چاہتے ہو تو اس کا یہ راستہ ہے' جو بہت بہتر اور سب سے عمدہ اور خوبصورت شکل ہے لوٹنے کی اور اپنے معاملے کو لوٹانے کی۔کیونکہ آیت میں الفاظ آئے ہیں:﴿ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ﴾ تو یہ اس کی ظاہری شکل اور کامیابی کی طرف لوٹنا ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی بیعت کی متفق علیہ حدیث کی ایک روایت میں:'' وَعَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ '' کے بعد اِن الفاظ کا اضافہ ہے:''اِلَّآ اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ ''[1] ۔یہ الفاظ حضور ﷺ نے ارشاد فرمائے ہوں گے' اس لیے کہ یہاں صیغہ بدل گیا ہے۔ان الفاظ میں حضور ﷺ نے گویا ایک مضمر شے کو نمایاں فرمایا:''سوائے اس کے کہ تم کھلم کھلا کفر کا مشاہدہ کرو جس کے ضمن میں تمہارے پاس اللہ کی طرف سے برہان ہو (دلیل اور سند ہو)''۔کوئی بھی محض اپنے ذاتی خیال اور وجدان کی بنیاد پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں حدودِ شریعت سے تجاوز ہو رہا ہے' بلکہ یہاں تو واضح دلیل اور سند کی ضرورت ہے۔ ورنہ تو نظم کہاں رہا! پھر تو سمع وطاعت کی روح غائب ہوگئی! سمع وطاعت کے پورے نظام کی چولیں ہل جائیں گی۔

تنازُع کی ممانعت اور اس کے ممکنہ نتائج

اب آگے چلیے! سورۃ الانفال (آیت ۴۶) میں فرمایا:﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾''اور اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی''۔اب یہاں اَطِيْعُوْا کا لفظ رسول کے ساتھ بھی دہرا کر نہیں لایا گیا۔اس لیے کہ الفاظ کے استعمال میں بھی قرآن مجید میں لفاظی نہیں ہے' کم سے کم جچے تلے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہاں چونکہ امراء کے اس سلسلے کو نمایاں کرنا اور اس میں فرق وتفاوت کو واضح کرنا مقصود نہیں تھا' لہٰذا ایک ہی بار''اَطِيْعُوْا''لایا گیا۔اور قرآن میں ہمیشہ''اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ'' ہی آتا ہے کہ''اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو''۔

رسول اللہ ﷺ کی جملہ حیثیتوں میں ایک حیثیت مدنی دَور میں یہ بھی تھی کہ آپ ﷺ حاکم یعنی چیف ایگزیکٹو اور چیف جسٹس بھی تھے اور قانون سازی کا سارا اختیار بھی آپ ﷺ کے ہاتھ میں تھا۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے کچھ چیزیں حرام کی ہیں اور میں نے بھی کچھ چیزیں حرام کی ہیں۔ یہاں میں آپ ﷺ کی جس حیثیت کو نمایاں کرنا چاہتا ہوں وہ قبل از ہجرت کی حیثیت ہے۔اس وقت مکہ میں آپؐ کی حکومت نہیں تھی' کوئی علاقائی تسلط آپؐ کو حاصل نہیں تھا۔ مکے میں تو آپ ﷺ مغلوب تھے' کمزور تھے۔ اگر چہ بظاہر الفاظ مناسب نہیں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ کفر کو غلبہ حاصل تھا' کفار ومشرکین کے ہاتھ میں اختیار تھا' صحابہ کرامؓ کو اذیتیں دی جارہی تھیں اور ان کی دادرسی کا بھی کوئی راستہ نہیں تھا۔اس حالت میں تو دراصل مسلمان ایک جماعت تھے' جس کے امیر محمدؐ رسول اللہ ﷺ تھے۔رسول ہونے کی حیثیت تو بلاشبہ تمام حیثیتوں سے بالاتر ہے۔اسی لیے اس حیثیت کو قرآن میں نمایاں کیا گیا ہے جو سب سے اعلیٰ' سب سے اہم اور سب سے بلند ہے۔لیکن سیرت النبیؐ کا مطالعہ کرتے ہوئے ہر جگہ پر دیکھئے کہ حضور ﷺ کس حیثیت سے اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔کہیں آپؐ صرف منصف کی حیثیت سے کام کر رہے ہوتے ہیں۔رسول کی حیثیت سے تو آپؐ سے خطا کا کوئی امکان نہیں ہے' لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ منصف کی حیثیت سے مجھ سے خطا ہوسکتی ہے۔ایک حدیث کا مفہوم کچھ اس طرح ہے کہ لوگو! تم میرے پاس اپنے مقدمات لے کر آتے ہو' کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق زیادہ چرب زبان ہے' اپنی بات کو دلیل کے ساتھ زیادہ زوردار انداز میں پیش کرسکتا ہے' جبکہ دوسرا بیچارہ اس پہلو سے عاجز ہے' تو وہ چرب زبان مجھ سے غلط فیصلہ کروالیتا ہے۔تو جان لو کہ میری عدالت سے بھی اگر تم کوئی غلط ڈگری لے گئے اور کسی زمین کے ٹکڑے کے بارے میں تم نے غلط فیصلہ حاصل کرلیا تو جان لو کہ وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہوگا جو تم لے کر جاؤ گے۔کس قدر واضح حدیث ہے کہ بحیثیت منصف خطا ہوسکتی ہے۔ وہ تو صرف رسول کی حیثیت ہے جو خطا سے پاک ہے' منزہ ہے' معصوم ہے۔

غزوۂ بدر میں رسول اللہ ﷺ نے ایک مقام بتایا کہ یہاں پڑاؤ کیا جائے۔صحابہؓ نے کہا کہ حضورؐ! اگر تو یہ وحی کا فیصلہ ہے' یہ آپؐ کا بحیثیت رسول امر ہے تو سر تسلیم خم ہے' ہماری عقلیں وحی کے مقابلے میں عاجز ہیں' ناقابل التفات ہیں۔لیکن اگر معاملہ یہ نہیں ہے تو اجازت دیجیے کہ ہم عرض کریں! جب اجازت مل گئی تو صحابہ نے عرض کیا کہ حضورؐ! جنگی مہارت اور جنگی علم وفہم کے اعتبار سے ہم عرض کررہے ہیں کہ یہ جگہ مناسب نہیں ہے۔آپ ﷺ نے اسے تسلیم کرلیا اور پڑاؤ وہاں سے اٹھا کر دوسری جگہ ڈالا جہاں صحابہؓ نے

مشورہ دیا تھا۔تو اگر ان تمام حیثیتوں کو علیحدہ علیحدہ نہیں رکھا جاتا تو آدمی مغالطے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔تو یہاں فرمایا:﴿ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا ﴾''اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور جھگڑا مت کرو''۔اب یہاں لفظ تنازُع آ گیا کہ جھگڑا مت کرو' کھینچ تان مت کرو۔اگر یہ کرو گے تو کیا ہو گا؟﴿ فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ ﴾''تو تم ڈھیلے پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی''۔'فَشَلَ' کا مطلب ہے کسی چیز کا ڈھیلا پڑ جانا۔میں نے ''کسا ہوا نظم'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔اس کے مقابلے میں ''ڈھیلا نظم'' ہے۔یعنی اب اس کا چاک و چوبند والا معاملہ نہیں رہا۔بعض تراجم میں ''فَتَفْشَلُوْا'' کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ ''تم نامرد ہو جاؤ گے''۔اس لفظ کی اس حوالے سے بڑی مناسبت ہے۔یہاں نظم کا ڈھیلا پڑنا مراد ہے جس کی طرف یہاں اشارہ ہو رہا ہے کہ اگر تم نے کھینچ تان شروع کر دی' اگر یہ تمہاری عادتِ ثانیہ بن گئی تو تمہاری ہمت ختم ہو جائے گی' تم پر نامردی سوار ہو جائے گی اور تم ڈھیلے پڑ جاؤ گے۔اور اس کا ایک اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ ﴿ وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ ﴾''اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی''۔یعنی کفار و مشرکین پر سے تمہاری دھاک ختم ہو جائے گی' تمہارا رعب اور دبدبہ ختم ہو جائے گا۔یہ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا نتیجہ نکل رہا ہے۔یہ گویا کہ اب اس تنازُع کی منفی کیفیت ہے جس سے یہ نتائج رونما ہوں گے۔اور یہ جان لو کہ اصل میں جماعتی نظم کا ڈھیلا پڑنا اس مقصد کو نقصان پہنچانے کا سبب بن جائے گا جس کے لیے جماعت قائم ہوئی تھی۔جماعت تو کسی مقصد کے لیے قائم ہوتی ہے۔جماعت بذاتہٖ تو مطلوب نہیں ہے۔وہ فی نفسہٖ مطلوب شے نہیں ہے' کسی مقصد کے لیے ہے۔تو تمہارا ڈھیلا پڑ جانا اور تمہاری ہوا کا اکھڑ جانا' اس کا نقصان اس مقصدِ عظیم کو پہنچے گا جس کے لیے تم نے وہ اجتماعیت اختیار کی اور اسے قائم کیا۔

آگے فرمایا:﴿ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۴۶ ﴾''اور صبر کرو (ڈٹے رہو' جمے رہو)' یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔اس میں صبر کا ایک پہلو اور بھی ہے کہ اطاعت امر کے لیے صبر کی ضرورت ہے۔ایک صبر ہے مخالفین کے مقابلے میں ڈٹے رہنا اور ایک صبر ہے ایذاء پر۔لیکن صبر علی الطاعة اور صبر عن المعصية بھی تو صبر کی قسمیں ہیں۔معصیت اور نافرمانی سے اپنے آپ کو روکنا بھی تو صبر ہے اور اطاعت پر کاربند رہنا بھی صبر ہے۔اس صبر علی الطاعة اور صبر عن المعصية کے لیے بھی وہی chain ہو گی' یعنی اللہ کی اطاعت پر صبر اور اللہ کی معصیت سے صبر' رسول کی اطاعت پر صبر اور رسول کی نافرمانی سے صبر' اسی طرح اولی الامر کی اطاعت پر صبر اور اولی الامر کی نافرمانی سے صبر۔ایک چیز سے اپنے آپ کو روکنا صبر ہے اور ایک چیز پر اپنے آپ کو جمانا صبر ہے۔چنانچہ یہاں دراصل اطاعت پر صبر کا حکم ہے۔اور اطاعت میں وہی تین کڑیاں پیشِ نظر رہیں گی:﴿ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ﴾''اطاعت کرو اللہ کی' اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے صاحبِ امر کی''۔اگرچہ لفظ ''صبر'' عام ہے لیکن درحقیقت یہ اسی صبر علی الطاعة کی طرف اشارہ ہے۔اور اسی کی منفی شکل ہے صبر عن المعصية۔اطاعت اور معصیت پر صبر کا اوّلین استحقاق اللہ کا ہے' اس کے بعد رسول ﷺ کا اور پھر تیسرے درجے میں آتے ہیں وہ صاحبِ امر جو اہل ایمان میں سے ہوں۔

غزوۂ اُحد میں تنازُع فی الامر کا نتیجہ

اب اگر اس آیت کے ساتھ سورۃ آل عمران کی آیت ۱۵۲ کو جوڑ لیا جائے تو مضمون نکھر کر سامنے آ جائے گا۔یوں سمجھئے کہ غزوۂ اُحد کا واقعہ مذکورہ بالا آیت کی ایک مثال ہے۔یہ اس درس میں بہت اہم آیت ہے۔یہاں غزوۂ اُحد کے حالات پر تبصرہ ہو رہا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو بڑی زک پہنچی' شدید نقصان ہوا' ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے' حضور ﷺ خود مجروح ہوئے' آپ ﷺ کے دندانِ مبارک شہید ہوئے' چہرۂ مبارک لہولہان ہوا۔''فَتَفْشَلُوْا'' والی بات بھی ہوئی اور ''وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ'' کا نقشہ بھی سامنے آیا۔یہ سارے نتائج نکلے ہیں۔لہٰذا ایک عملی مثال سے اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ سمجھ لیا جائے! اب اللہ تعالیٰ تبصرہ فرما رہے ہیں کہ اے مسلمانو! ذرا غور کرو' ذرا نگاہِ باز گشت ڈالو اور سوچو کہ ایسا کیوں ہوا۔کیا ہم نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا تھا؟ کیا ہمارا نصرت کا وعدہ غلط تھا؟ کیا ہمیں کافروں سے محبت ہو گئی تھی؟ کیا ہم نے تمہارے مقابلے میں اُن سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا؟ کیا تمہیں ہم نے وَداع کر دیا تھا؟ تم سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا؟ 'وَداع' کا لفظ جو میں نے استعمال کیا ہے اس کا تعلق سورۃ الضحیٰ سے ہے' جس میں آپ ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے:﴿ مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۝۳ ﴾''آپ کے ربّ نے نہ آپ کو چھوڑا نہ وہ آپ سے ناراض ہوا''۔وہ ابتدائی مکی دَور ہے' اس میں صیغۂ واحد میں گفتگو ہو رہی ہے۔یہاں یہی سمجھئے کہ ''مَا وَدَّعَكُمْ رَبُّكُمْ'' کہ تمہارے ربّ نے تمہیں چھوڑا نہیں ہے۔تمہارا ربّ تم سے کنارہ کش نہیں ہوا۔اس میں سے کوئی چیز نہیں ہوئی۔تو اب سمجھو کہ ہوا کیا ہے؟

فرمایا جا رہا ہے: ﴿ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ ﴾''اور اللہ نے تو تم سے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا جب کہ تم انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے اللہ کے حکم سے''۔لہٰذا پہلی بات تو یہ ذہن میں رہے کہ تم سے وعدہ خلافی نہیں ہوئی ہے۔﴿ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ۝۸۷ ﴾ (النساء) ''اللہ سے بڑھ کر سچی بات کرنے والا کون ہے؟'' اور:﴿ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ ﴾ (التوبۃ:۱۱۱) ''اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا وفا کرنے والا کون ہو گا؟'' تو وعدہ خلافی تو قطعاً نہیں ہوئی' بلکہ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔اہل ایمان کو پہلے ہی ریلے میں فتح حاصل ہو گئی تھی۔کفار بڑے لاؤ لشکر اور سامان کے ساتھ آئے تھے۔کفار کے مقابلے میں مسلمانوں کی نسبت پہلے ہی ایک اور تین کی

تھی اور اب منافقین کے واپس چلے جانے کے بعد ایک اور چار کی ہو چکی تھی‘ اس کے باوجود اللہ کا وعدہ صد فیصد درست ثابت ہوا‘ لیکن یہ واضح فتح شکست میں کیوں بدلی‘ اس کو ذرا سمجھو! فرمایا:﴿ حَتّٰٓی اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِی الْاَمْرِ ﴾ ’’یہاں تک کہ جب تم ڈھیلے پڑے (تم نے نظم کو ڈھیلا کر دیا) اور تم نے امر میں جھگڑا کیا (کھینچ تان کی)‘‘۔ اب دیکھئے سورۃ الانفال کی آیت ۴۶ والے الفاظ ہی یہاں آ رہے ہیں۔ یہ بہت اہم الفاظ ہیں۔ میں نے اسی لیے وضاحت میں ’’نظم کو ڈھیلا کرنا‘‘ اور ’’تنازُع‘‘ کے الفاظ استعمال کیے ہیں‘ تاکہ ایک شے کی حقیقت کھل کر سامنے آئے۔ اسے فقہ اللغۃ کہتے ہیں کہ لغت کے اندر بصیرت کا حاصل ہو جانا۔ یعنی ایک لفظ کا مفہوم‘ اس کی مراد‘ اس کے مجازی معنی اور اس کے حقیقی معنی کو سمجھنا۔ ہر لفظ کا ایک باطن ہوتا ہے‘ اسے سمجھ لینے سے بصیرتِ باطنی پیدا ہوتی ہے۔

یہاں یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ سورۃ الانفال غزوۂ بدر کے بعد اور غزوۂ اُحد سے پہلے نازل ہوئی ہے جس کی آیت ۴۶ کا ہم نے مطالعہ کیا ہے۔ وہاں مسلمانوں کو پیشگی حکم دیا گیا تھا کہ: ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا ﴾ ’’اور اطاعت کرو اللہ اور اس کے رسول کی اور جھگڑا مت کرو!‘‘ اور پیشگی تنبیہہ بھی کر دی گئی تھی: ﴿ فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُكُمْ ﴾ ’’ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی‘‘۔ یعنی ایسا بھی نہیں ہوا کہ پیشگی متنبہ نہ کیا گیا ہو۔ لیکن پھر تم نے (غزوۂ اُحد کے موقع پر) نظم کو ڈھیلا کیا اور امر میں جھگڑا کیا‘ کھینچ تان کی۔ یہ کس کا امر تھا جس میں جھگڑا ہوا اور کھینچ تان ہوئی؟ اسے بھی تنقیح کے ساتھ سمجھ لیجیے۔ اصلاً تو امر محمدؐ رسول اللہ ﷺ کا تھا جو اُس وقت سپہ سالارِ اعلیٰ ہیں۔ یہ کوئی نص کا معاملہ نہیں تھا‘ بلکہ تدبیر سے متعلق معاملہ تھا کہ اس درّے سے یہ پچاس تیر انداز ہرگز نہ ہٹیں۔ لیکن اپنی بات کی تاکید کے لیے حضور ﷺ کی زبان مبارک سے جو الفاظ نکلے وہ یہ تھے کہ ’’خواہ تم یہ دیکھو کہ ہم سب شہید ہو گئے ہیں اور پرندے ہماری بوٹیاں نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی تم یہاں سے مت ہٹنا‘‘۔ یہ انتہائی تاکیدی الفاظ ہیں۔ اب وہاں پچاس افراد ہیں اور ان کا ایک کمانڈر ہے۔ اب صورتِ واقعہ یہ ہے کہ رسولؐ وہاں موجود نہیں ہیں۔ اب صورت یہ ہوئی کہ فتح ہو گئی۔ اب تاویل کا اختلاف ہو گیا۔ اکثر تیر اندازوں نے کہا کہ اب تو فتح ہو گئی‘ کس لیے یہاں کھڑے ہو‘ چلو یہاں سے! جبکہ ان کا کمانڈر انہیں روک رہا ہے کہ دیکھو‘ رسول اللہ ﷺ کے حکم کو یاد کرو۔ لیکن ان کا موقف یہ تھا کہ وہ حکم تو اُس وقت تھا اگر شکست ہوتی‘ سب مارے جاتے‘ سب شہید ہو جاتے۔ اب تو فتح ہو گئی ہے‘ یہ حکم اب یہاں پر نافذ نہیں ہو رہا ہے۔ اب پہلے درجے میں یہ دیکھئے کہ یہ نص کا نہیں‘ بلکہ تدبیر کا معاملہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس تدبیر کے معاملے میں بھی معصیتِ صریحہ نہیں ہے‘ بلکہ تاویل ہے۔ اس تاویل کی وہ مثال بھی ذہن میں رکھئے گا کہ ’’عصر کی نماز نہ پڑھنا جب تک بنوقریظہ کے ہاں نہ پہنچ جاؤ‘‘۔ اس کی دونوں تاویلیں ہوئیں۔ ایک تاویل یہ ہوئی کہ عصر کی نماز سے پہلے پہلے بنوقریظہ تک پہنچنا لازمی ہے اور دوسری یہ کہ بنوقریظہ کے ہاں پہنچ کر ہی عصر کی نماز پڑھنی ہے۔ اور دونوں کو حضور ﷺ نے مساوی قرار دیا۔ تو یہ تاویل کی بات ہے۔ لیکن اب تیسرے درجے پر آیئے! اگر کمانڈر یہ تاویل قبول کر لیتا تو یہ تاویل کی بات ہو جاتی‘ لیکن کمانڈر نے قبول نہیں کی تو اب لازماً کمانڈر کا حکم چلے گا۔ یہاں معاملہ نظم کا ہے۔ جسے امیر بنایا گیا تھا تاویل تو اس کی چلنی تھی نہ کہ مأمورین کی۔ لہٰذا معصیت ہوئی تو اس کمانڈر کی۔

یہاں میں نے معاملے کو کتنا dilute کر دیا۔ یہاں معاذ اللہ‘ اللہ کے حکم کی یا رسول ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ یہاں معاملہ نصوص کا نہیں‘ تدبیر کا ہے اور تدبیر میں بھی کھلم کھلا سرتابی نہیں ہے‘ بلکہ تاویل ہے۔ تاویل اگر کمانڈر کی ہوتی تو یہ غلطی نظر انداز ہو جاتی۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو نظر انداز فرما دیتا۔ لیکن وہاں نظم ٹوٹا ہے‘ کمانڈر کا حکم نہیں مانا گیا اور ۳۵ تیر انداز وہاں سے چلے گئے‘ ۱۵ رہ گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ اصلاً مطلوب یہ ہے کہ اس کا تجزیہ کر کے‘ تنقیح کر کے اچھی طرح سمجھ لیجیے۔

مؤمن کا نصب العین ۔ رضائے الٰہی اور فلاحِ اُخروی

آگے فرمایا:﴿ وَعَصَیْتُمْ ﴾ ’’اور تم نے نافرمانی کی‘‘۔ میں صراحت کر چکا ہوں کہ نافرمانی اللہ اور اس کے رسول کی نہیں‘ بلکہ کمانڈر کی ہوئی ہے جس پر گرفت کی جا رہی ہے۔ اس لیے کہ بیعت میں یہ بھی کہا گیا ہے: اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ ’’کہ ہم اصحاب امر سے نہیں جھگڑیں گے (کھینچ تان نہیں کریں گے)‘‘ اب گویا تم نے اس میں معصیت کی ﴿ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ﴾ ’’اس کے بعد کہ اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھا دی جو تمہیں پسند ہے‘‘۔ عام طور پر لوگ اس بارے میں مغالطے میں مبتلا ہیں کہ اس سے مراد مالِ غنیمت ہے۔ یہ مالِ غنیمت والی بات تو بالکل ہی غلط ہے۔ اس لیے کہ مالِ غنیمت کا مسئلہ اُس وقت تو ہو سکتا تھا اگر غزوۂ بدر کی بات ہوتی‘ جبکہ ابھی مالِ غنیمت کی تقسیم کا قانون نہیں آیا تھا۔ اُس وقت تک یہ روایت تھی کہ جو بھی شخص جتنا مال بھی جمع کر لے گا وہ اسی کا ہے۔ تو ہر شخص کے اندر خود بخود ایک طلب (urge) پیدا ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ مال جمع کر لے۔ اس صورتِ حال میں کوئی شخص سوچ سکتا تھا کہ ہم یہاں کھڑے رہ گئے تو ہمارے ہاتھ پلّے کچھ پڑے گا نہیں۔ لیکن سورۃ الانفال میں مالِ غنیمت کا حکم تو بیان ہو چکا تھا اور حضور ﷺ اس پر عمل کر چکے تھے۔ مالِ غنیمت کے بارے میں حکم یہ تھا کہ سارا مال جمع ہو گا‘ اس کا پانچواں حصہ بیت المال کا ہو گا اور بقیہ سارا مال مجاہدین میں مساوی تقسیم کیا جائے گا۔ اور اس تقسیم میں بھی فرق یہ ہو گا کہ پیدل کے لیے اکہرا اور سوار کے لیے دوہرا حصہ ہو گا‘ چاہے کوئی پہرے پر ہی کھڑا رہا ہو اور اس نے تلوار اٹھائی ہی نہ ہو۔ بلکہ

حضور ﷺ نے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بھی حصہ لگایا اگرچہ وہ وہاں شریک بھی نہیں تھے‘ کیونکہ وہ حضور ﷺ کے حکم سے مدینہ منورہ میں رہ گئے تھے۔ لہٰذا اُن کو بھی اس غزوہ میں شریک فرض کیا گیا۔

تو جب یہ قانون آ چکا تھا تو کسی کو کیا ضرورت تھی کہ وہاں جاتا کہ مال جمع کرے؟ اس خیالِ خام کو ذہن سے نکال دیجیے۔ اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بڑا سوءِ ظن پیدا ہوا ہے۔ کیونکہ یہ تو ابھی سن ۳ ہجری کا واقعہ ہے اور اس میں تمام سابقون الاوّلون شریک ہیں۔ اس میں تو منافقین شریک بھی نہیں ہوئے تھے‘ بلکہ عبداللہ بن اُبی کے ساتھ میدان چھوڑ کر واپس جا چکے تھے۔ یہ سن ۱۰ یا ۱۱ کی بات ہوتی تو کسی قدر قابلِ التفات ہوتی کہ اب تو بہت کچے پکے لوگ بھی مسلمانوں کے لشکر میں شامل ہو گئے تھے۔ جبکہ یہ تو خالص لوگ تھے۔ ان سے یہ سوءِ ظن بہت بڑی غلطی ہے جن لوگوں کے ذریعے سے بھی پھیلی ہے۔ اصل بات کیا تھی؟ سورۃ الصّف کی آیت ۱۳ سے یہ بات کھل رہی ہے‘ جہاں فرمایا: ﴿وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ط نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ط﴾ ’’ایک اور چیز جو تمہیں پسند ہے‘ (یعنی) اللہ کی طرف سے مدد اور فتح جو قریب ہے‘‘۔ یہ فتح کی طلب اور فتح کی قدر و قیمت ہے جس سے تم ڈھیلے پڑتے ہو۔ حالانکہ ؏

’’شکست و فتح نصیبوں سے ہے ولے اے میرؔ!‘‘

اصل کامیابی تو یہ ہے کہ تم بس اللہ کی راہ میں اپنا تن من دھن لگا دو۔ جہاں تمہارے اندر جلد سے جلد فتح حاصل کرنے کی طلب پیدا ہو جائے گی‘ یا تم عجلت پسندی کا شکار ہو جاؤ گے‘ یا کوئی راہِ یسیر (شارٹ کٹ) تلاش کرو گے‘ ٹیڑھی انگلیوں سے مکھن نکالنے کی کوشش کرو گے تو نتیجتاً اصل منزل سے ہٹ جاؤ گے۔ یہ ساری حماقتیں صرف اس لیے ہوتی ہیں کہ دُنیوی فتح محبوب ہے۔ دنیاوی سطح پر کامیاب ہو جانا‘ اس کی نگاہ کے اندر اہمیت پیدا ہو گئی ہے اور یہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ غزوۂ اُحد میں بھی غلطی اسی بنیاد پر ہوئی۔ یہ بات بالکل نفسیاتی اعتبار سے ہے۔ جب آپ طے کرتے ہیں کہ آپ کو سو (۱۰۰) میل جانا ہے تو آپ شاید ۸۰ یا ۹۰ میل پر جا کر کچھ ڈھیلے پڑیں کہ اب تو منزل قریب آ گئی ہے۔ اور اگر آپ نے اپنی منزل ہی ۲۰ میل پر متعین کر لی ہے تو یہی کیفیت ۱۷‘۱۸ میل پر پیدا ہو جائے گی۔ کسی شخص کی اپنے کام کے لیے جتنی مطابقت (adjustment) ہوتی ہے اس کے اندر اتنے ہی عرصہ کے لیے چاک و چوبند ہونے اور آمادۂ عمل رہنے کی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ اور منزل پر پہنچ کر تو آدمی ڈھیلا پڑ تا ہی ہے۔ اس کے بعد تو اعصاب ڈھیلے پڑتے ہیں‘ آدمی کپڑے اتارتا ہے اور پُرسکون (relax) ہو جاتا ہے کہ اب پہنچ گئے۔ تو یہی فرمایا جا رہا ہے کہ تم نے اس relaxation کے تحت نظم کو ڈھیلا کیا ہے۔ جس انداز سے میں نے یہ آیت سمجھائی ہے اس طرح حقیقت کے اعتبار سے ہمیں جو سبق لینا ہے وہ ہمیں پورا مل جائے گا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں سوءِ ظن بھی نہیں رہے گا۔

اسی آیت میں آگے فرمایا جا رہا ہے: ﴿مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ج﴾ ’’تم میں سے کچھ وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور کچھ آخرت چاہتے تھے‘‘۔ اب اس کی تاویل بھی ہم اسی طور سے کریں گے کہ تم میں وہ بھی ہیں جو دنیا میں فتح کے طالب ہیں اور وہ بھی ہیں جو صرف آخرت کے طالب ہیں۔ جبکہ اصل کامیابی تو آخرت کی کامیابی ہے۔ جیسے سورۃ التغابن میں آیا: ﴿يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ط﴾ (آیت ۹) ’’جس دن (اللہ) تم کو جمع کرے گا جمع ہونے کے دن وہ ہو گا اصل ہار اور جیت کے فیصلے کا دن‘‘۔ ہار اور جیت کا فیصلہ تو وہاں ہو گا‘ یہاں کی ہار ہار نہیں‘ یہاں کی جیت جیت نہیں۔ کتنے ہیں جو جیت کر ہارتے ہیں اور کتنے ہیں جو ہار کر جیتتے ہیں۔ سورۃ التغابن کے یہ الفاظ اپنے دل پر نقش کر لیجیے۔ یہاں کی فتح کا تصور ہی نہ رکھو۔ اس دنیا کی کامیابی کی کوئی غرض ہی نہ رکھو! بلکہ احساسِ فرض کے تحت حرکت کرو۔ دنیا میں کامیابی کا کتنے فیصد امکان ہے اور کتنے فیصد نہیں ہے‘ یہ حساب کتاب اس راستے پر نہیں چلے گا۔ صد فیصد ناکامی کا یقین ہو پھر بھی انسان اس راہ پر چلے گا اگر اس کا مطلوب صرف آخرت ہو۔ یہی بات تھی کہ جنگ موتہ کے موقع پر صرف تین ہزار کا لشکر ایک لاکھ سے ٹکرا گیا تھا۔ اور وہ کسی ایک شخص کا فیصلہ بھی نہیں تھا‘ بلکہ اس ضمن میں باقاعدہ مشورہ ہوا ہے‘ باقاعدہ تقریریں ہوئی ہیں۔ یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ یہ معاملہ درست نہیں ہے‘ کیونکہ نسبت تناسب میں بہت زیادہ فرق ہے‘ ایک اور تینتیس کی نسبت ہے۔ لیکن کچھ لوگوں نے کہا‘ اور ان کی رائے مانی گئی‘ کہ ہمارا مطلوب و مقصود فتح کب ہے؟ ہمارا مطلوب و مقصود تو شہادت ہے!

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

لہٰذا وہاں افہام و تفہیم سے بات طے ہوئی‘ کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ اور اس پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کوئی سرزنش نہیں کی گئی‘ بلکہ مسلمانوں نے اس بات پر سرزنش کی کہ یہ لوٹ کر کیوں آئے؟ لوگوں نے ہاتھوں میں ریت اٹھا کر لوٹنے والوں کے چہروں پر پھینکی۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن کا دفاع کیا اور فرمایا کہ انہوں نے میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار نہیں کی‘ بلکہ ان کا معاملہ ’’مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ‘‘ والا ہے‘ یعنی اپنی اصل قوت کی طرف رجوع کرنے کا معاملہ ہے‘ تاکہ پھر سے طاقت لے کر آئیں اور حملہ کریں‘ یہ فرار نہیں ہے۔

بہرحال اس فرق کو ذہن میں رکھئے! اسی لیے ہم اتنی وضاحت سے بحث کرتے ہیں کہ ہمارا نصب العین صرف اور صرف اللہ کی رضا اور اُخروی فلاح ہے۔ نصب العین انقلاب یا اقامت دین اور دین کا غلبہ نہیں ہے۔ جہاں یہ چیزیں نصب العین کے درجہ میں آئیں گی وہاں حماقتیں لازماً ہوں گی' غلطیاں لامحالہ ہوں گی۔

آگے ارشاد ہوا: ﴿ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ج ﴾ ''پھر اللہ نے تمہیں پھیر دیا اُن سے' تاکہ تمہیں آزمائے''۔ دیکھئے عجیب انداز ہے کہ ''تمہیں پھیر دیا اُن سے''۔ مطلب یہ کہ تم دشمنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ اب ہوا یہ کہ تم جس کی قوت سے یہ سب کچھ کر رہے تھے اب اس قوت نے گویا تمہارا رُخ پھیر دیا۔ کفار نے تمہارا رُخ نہیں پھیرا' یہ رُخ اس نے پھیرا ہے' تاکہ تمہیں جانچے پرکھے' تمہیں ابتلاء میں ڈالے' تاکہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو اور تم آئندہ کے لیے اپنی اصلاح کر سکو۔ تمہاری اس غلطی سے درگزر بھی کیا جا سکتا تھا کہ تمہیں اُس وقت کوئی سزا نہ دی جاتی' لیکن پھر یہ غلطی تمہارے اندر راسخ ہو جاتی۔ پھر تمہارا ڈھیلا پن مستقل ہو جاتا۔ تمہیں سبق سکھانا مقصود تھا' تمہاری تربیت پیش نظر تھی' تمہاری اصلاح مقصود تھی۔ سرزنش اس لیے ضروری تھی تاکہ ایک دفعہ بات واضح ہو جائے کہ نظم کسے کہتے ہیں' ڈسپلن کے کیا معنی ہیں' اطاعتِ امر کی کیا حیثیت اور کیا اہمیت ہے۔ یہاں ''لِيَبْتَلِيَكُمْ'' کا لفظ آیا ہے کہ اللہ تمہاری آزمائش کرے۔ بَـلَا' يَبْلُوْ آزمائش کے لیے آتا ہے۔ اسی سے ابتلاء بنا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط ﴾ (الملک:۲) ''اللہ نے موت اور حیات کو پیدا فرمایا تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون حسنِ عمل کا مظاہرہ کرنے والا ہے''۔

اہل ایمان کی تسلی کے لیے آگے فرمادیا: ﴿ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ط ﴾ ''اور واقعی وہ تمہیں معاف فرما چکا''۔ اب تمہارے لیے آخرت کی کوئی سزا نہیں ہے' جو بھی سرزنش تھی یہاں ہوگئی۔ ﴿ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ ﴾ ''اور اللہ اہل ایمان پر بہت بڑے فضل والا ہے''۔

''اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ '' کا مفہوم

سورۂ آل عمران' آیت ۱۵۴ میں الفاظ ہیں: ﴿ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ط ﴾ ''یہ کہتے ہیں کہ ہمارا بھی امر میں کوئی حصہ ہے یا نہیں؟'' یعنی ہماری بھی کوئی بات مانی جائے گی یا نہیں؟ کوئی ہماری بھی رائے چلے گی یا نہیں؟ یہ انسان کی طبعی وفطری کمزوری ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ میرے ہاتھ میں بھی اختیار ہو' میری رائے کو بھی اہمیت دی جائے۔ یہی وہ sense of participation ہے جسے ملحوظ رکھنا حکومت اور ریاست کی سطح پر بہت ضروری ہے کہ ہمارا معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے' ہم اس میں شرکت (participate) کر رہے ہیں' ہماری رائے سے فیصلے ہوتے ہیں۔ لیکن جماعتی سطح پر' اُس نظم میں جو بیعتِ سمع وطاعت پر قائم ہو' یہی چیز سب سے بڑی مہلک شے بن جاتی ہے۔ چنانچہ ان کی اس بات کا کہ ''اس امر میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے یا نہیں؟'' جو جواب دیا گیا وہ بڑا عجیب ہے: ﴿ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ط ﴾ ''(اے نبی! ان سے) کہہ دیجیے کہ یقیناً امر تو کُل کا کُل اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ اس جواب پر وہ کہہ سکتے تھے کہ ہم نے تو رسول کے حکم سے اختلاف کیا تھا' اللہ کے حکم سے کب کیا تھا؟ یہ تو رسول کا اجتہادی حکم تھا۔

اس کا پس منظر ذہن میں رکھئے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر عبداللہ بن اُبی اور اس کے ۳۰۰ ساتھی کیوں واپس گئے تھے؟ اس لیے کہ اُس نے یہ رائے دی تھی کہ مدینہ میں محصور رہ کر دفاع کیا جائے۔ جیسے کہ دو سال بعد غزوۂ احزاب میں ہوا اور اللہ کے فضل وکرم سے بارہ ہزار کے لشکر کا مقابلہ کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ کی اپنی رائے بھی یہی تھی' لیکن آپؐ نے صحابہ کرام ؓ کے جوشِ ایمان اور ذوقِ شہادت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی رائے کا احترام کیا اور مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ اب دیکھئے۔ اوّلاً یہ اللہ کا حکم نہیں تھا' ثانیاً رسول اللہ ﷺ کی بھی یہ رائے نہیں تھی۔ ہاں' رسولؐ نے جو فیصلہ کر دیا یہ اس کی مخالفت ہے۔ اگرچہ رسولؐ نے اپنی رائے کو پس پشت رکھ کر اپنے ساتھیوں کی رائے کے مطابق فیصلہ کیا' لیکن اب اس سے اختلاف رسول اللہ ﷺ کے فیصلے سے اختلاف ہے۔ چنانچہ اس کو واضح کر دیا گیا کہ چاہے یہ اتنا سا معاملہ ہے' لیکن حقیقت میں یہ اللہ کی معصیت ہے' یہ اللہ کے اختیار کو چیلنج کرنا ہے۔ ایک سپاہی جب یونیفارم میں ہے تو وہ حکومت کا نمائندہ ہے' اس کی توہین حکومت کی توہین ہے اور اس کی اطاعت حکومت کی اطاعت ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک حکومتی نظم کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اگر وہ وردی میں نہیں تو عام انسان ہے' اس کے ساتھ آپ کا جھگڑا ذاتی سطح پر شمار ہوگا' لیکن اگر وہ وردی اور پیٹی میں ہے تو اسے چیلنج کرنا حکومت کو چیلنج کرنا ہے۔ لہٰذا یہ نظم کا معاملہ ہے۔ اور جب یہ اس سطح پر آئے گا تو بات اللہ تک پہنچتی ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ امر کُل کا کُل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ حالانکہ ہم ابھی سورۃ النساء کی آیت میں ''اُولِی الْاَمْرِ'' کے الفاظ پڑھ کر آئے ہیں' یعنی تم میں سے جو اصحابِ امر ہیں۔ بظاہر تو یہاں تضاد معلوم ہوتا ہے کہ یہاں فرمادیا: ﴿ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ط ﴾ ''کہہ دیجیے کہ امر کُل کا کُل اللہ کے لیے ہے!'' تو اس تضاد کو جو بظاہر پیدا ہو رہا ہے' رفع کر لیجیے۔ درحقیقت اس chain کے ساتھ اگر کوئی امر آ رہا ہے تو وہ حقیقتاً اللہ کا ہے' وہ علیحدہ نہیں رہا۔ اللہ کا رسول حکم دے رہا ہے تو اللہ کا حکم ہے۔ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کے نیچے جو نظمِ جماعت بنا ہے اس کا حکم بھی اللہ کا حکم ہے ع

''ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مؤمن کا ہاتھ!''

آیۂ استخلاف کے مضامین کا اجمالی جائزہ

آج کے درس کے ضمن میں آخری مقام سورۃ النور کی تین آیات (۵۴ تا ۵۶) پر مشتمل ہے۔ اس میں سے اکثر حصے کا مفہوم تو ہمارے سامنے آچکا ہے' صرف ایک نکتہ ہے جس کی وضاحت درکار رہے' باقی ہم صرف ترجمہ کریں گے۔ فرمایا: ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ج﴾ ''کہہ دیجیے (اے نبیؐ!) اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی''۔ اب یہاں ہر جگہ پر مقدر (understood) مانیے: ﴿وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ج﴾ ''اور اپنے میں سے اصحابِ امر کی''۔ آگے فرمایا: ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ط﴾ ''پھر اگر وہ روگردانی کریں (پیٹھ موڑ لیں) تو جان لو کہ رسولؐ پر ذمہ داری ہے اس کی جس کا بوجھ اس پر ڈالا گیا ہے اور تم پر ذمہ داری ہے اس کی جس کا بوجھ تم پر ڈالا گیا''۔ صاحب امر بھی اللہ کے ہاں مسئول ہے اور تم بھی اللہ کے ہاں مسئول ہو۔ رسول کے ذمہ ابلاغ اور تبلیغ کا حق ادا کر دینا ہے اور تمہارے ذمہ اسے قبول کرنا ہے۔ اگر بالفرض ابلاغ میں کمی رہی تو رسول پکڑے جائیں گے اور اگر انہوں نے اپنا کام پورا کر دیا تو رسول بری ہو جائیں گے اور اب ساری پُرسش تمہاری ہوگی۔ اسی طرح امراء کے ذمے جو بھی فرائض اور ذمہ داریاں ہیں وہ ان کے مسئول ہیں' انہوں نے جلد بازی میں فیصلہ کر لیا تو اپنی جواب دہی اللہ کے یہاں کریں گے' انہوں نے تمہارے ساتھ وہ طرزِ عمل اختیار نہیں کیا جو کرنا چاہیے تھا تو وہ اس کے لیے اللہ کے حضور جواب دہ ہوں گے' لیکن اگر مأمورین نے اپنے فرائض ادا نہ کیے تو اُن کی پُرسش ہوگی۔ دنیا میں کوئی چیز یک طرفہ تو ہوتی نہیں۔ اگر مأمورین کے کچھ فرائض ہیں تو امراء کے بھی فرائض ہیں اور امراء کے حقوق ہیں تو مأمورین کے بھی کچھ حقوق ہیں۔ لیکن ہمارا تصور یہ ہے کہ ہر شخص اپنے فرائض کی ادائیگی پر توجہ کو مرتکز کرے' اپنے حقوق کی طلب پر توجہ کا ارتکاز نہ کرے۔ اگر کوئی حق مارا گیا تو دنیاوی اعتبار سے تو نقصان ہے' مگر اُخروی اعتبار سے نفع ہے۔ ذمہ داری تو اس پر ہے جس نے آپ کا حق مارا ہے۔ آخرت میں جا کر لین دین ہو جائے گا' حساب کتاب ہو جائے گا۔ وہاں تم کچھ حاصل ہی کرو گے' ہاتھ سے کچھ دینا نہ پڑے گا۔ اگر اصل ''یوم التغابن'' آخرت ہے تو تمہارے لیے یہ نفع کا سودا ہے' نقصان کا تو نہیں۔

یہاں سورۃ الاعراف کی یہ آیت بھی پیش نظر رکھئے جو تصورِ شہادت علی الناس کے ضمن میں بہت اہم ہے: ﴿فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٦﴾﴾ ''ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے ان سے بھی جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا تھا اور لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی''۔ رسول بھی تو مسئول ہے' وہ بھی بندہ ہے (وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ) پھر ان کے نیچے جو بھی نظمِ جماعت کے صاحبِ امر ہوں گے وہ بھی غیر معصوم انسان ہیں' ان سے بھی خطا اور نسیان کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ لہٰذا سمجھنے کی اصل بات یہ ہے کہ تم اپنی ذمہ داری کو دیکھو کہ کیا ہے' اس میں تو کوئی کمی نہیں کر رہے؟ اس کی جواب دہی تمہیں کرنی پڑے گی۔

﴿وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ط﴾ ''اور اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے''۔ ﴿وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿٥٤﴾﴾ ''اور رسول کے ذمہ نہیں ہے مگر صاف صاف پہنچا دینا''۔

آگے فرمایا: ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ......﴾ ''اللہ نے وعدہ کیا ہے تم سے یعنی اُن سے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے......'' میں نے ''یعنی'' کے ساتھ ترجمہ اس لیے کیا ہے کہ یہاں ''مِنْ'' ''تبعیضیہ نہیں ہے' بلکہ ''مِنْ'' بیانیہ ہے۔ اس وعدہ کے اوّلین مخاطب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں اور ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں ہے کہ بعض کے ساتھ یہ وعدہ ہوا اور بعض کے ساتھ نہ ہو' بلکہ مِنْ بیانیہ ہے کہ تم سے یعنی اُن سے جو ایمان لائے ہوں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہوں۔ البتہ ان کے بعد سب کے لیے یہ مِنْ تبعیضیہ ہے۔ یہ نہیں کہ جو بھی جماعت قائم ہو جائے اور جو لوگ بھی اس کام کے لیے کمر کس لیں اُن سے یہ وعدہ ہے۔ بلکہ اُن کے ساتھ اللہ کا وعدہ ایمان اور عمل صالح کے تقاضوں کے ساتھ مشروط ہوگا۔ حتمی اور قطعی وعدہ اور بشارت صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے تھی۔ بعد کا معاملہ مشروط رہے گا۔ جو جس درجہ میں ان تقاضوں کو پورا کرے گا اسی درجہ میں وہ اس وعدہ کا مصداق بننے کی امید رکھ سکتا ہے۔ اور پھر بھی ہو سکتا ہے کہ ایک جماعت اپنے تئیں یہ سمجھ رہی ہو کہ وہ ایمان اور عمل صالح کے تقاضے پورے کر رہی ہے' لیکن ابھی اس کا اقتدار اللہ کی حکمت اور مصلحت میں نہ ہو۔ ابھی کوئی کمی ہے جسے اللہ جانتا ہے۔ تم تو اپنے آپ کو کامل سمجھ رہے ہو مگر اللہ جانتا ہے کہ تم کتنے کچھ کامل ہو اور کتنے کچھ نہیں ہو۔ ﴿فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ ط هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿٣٢﴾﴾ (النجم) ''اپنے آپ کو نفسِ مزکّیٰ نہ سمجھا کرو' وہ جانتا ہے اس کو جو واقعی متقی ہے''۔ بہر حال اللہ کا یہ وعدہ اُن لوگوں سے ہے جو ایمان اور عمل صالح کے تقاضے پورے کر دیں گے۔ یہاں اپنے ذہن میں سورۃ العصر کے مضامین تازہ کیجیے اور پھر پورا منتخب نصاب ذہن میں لے آیئے۔ عمل صالح سے مراد صرف نماز' روزہ اور نوافل نہیں' بلکہ عمل کا پورا ایک جامع تصور ہے۔ ایمان بھی صرف زبانی اقرار کا نام نہیں' بلکہ اس کے عملی تقاضے پورے کرنا بھی ضروری ہے۔

اللہ نے ان سے کیا وعدہ کیا ہے: ﴿لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ص﴾ ''وہ لازماً انہیں زمین میں خلافت عطا فرمائے گا جیسے کہ اس نے ان سے پہلوں کو خلافت عطا فرمائی تھی''۔ یہ آیت مبارکہ خاص طور پر یہاں شامل کی گئی ہے' ورنہ پہلی آیت پر ہمارا یہ درس مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ بہت اہم آیت ہے اور یہ خلافت راشدہ کی حقانیت پر اہل تشیع کے خلاف برہانِ قاطع ہے۔ اللہ کا یہ وعدہ جن حضرات سے پورا ہوا کیا وہ ایمان اور عمل صالح کے اعلیٰ ترین معیار پر نہیں ہوں گے؟ یا پھر (معاذ اللہ)

اللہ کا وعدہ جھوٹا ہے اور اللہ منافقوں کے ساتھ یہ وعدہ کر رہا ہے؟ یہ خلافت بالفعل قائم ہوئی یا نہیں ہوئی؟ یہ تو تاریخی واقعہ ہے' اس میں تو کسی کو اختلاف نہیں ہوگا۔ تو کن سے یہ وعدہ کیا گیا تھا؟ ﴿وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ یہ آیت ان کے غلط فلسفے اور گمراہ کن نظریات کے پورے تانے بانے کو ادھیڑ کر رکھ دینے والی ہے۔

اس وعدۂ استخلاف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: ﴿وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ﴾ ''اور وہ لازماً تمکن عطا فرمائے گا (زمین میں جما دے گا) اُن کے لیے اُن کے اس دین کو جو اللہ نے ان کے لیے پسند فرمالیا ہے''۔ یہ الفاظِ مبارکہ خلافت راشدہ کے لیے بھی سند ہیں اور خلفاء راشدین کے لیے بھی۔ ﴿وَ لَیُبَدِّلَنَّہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِہِمۡ اَمۡنًا ؕ﴾ ''اور لازماً بدل دے گا اُن کے خوف کی اس کیفیت کے بعد اُس کو امن کی ایک حالت سے''۔ ان الفاظ میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ جن حضرات کی رائے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ' کا عہدِ خلافت' خلافتِ راشدہ میں شامل نہیں ہے' ان کے موقف کے لیے بھی دلیل موجود ہے۔ اس لیے کہ اس پورے عرصے میں امن نہیں تھا' یہ جنگ وجدال کا دَور تھا' تلواریں ایک دوسرے کے خلاف چلتی رہیں۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ بہت منطقی انسان تھے۔ انہوں نے دو باتوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا کہ ایک شخص کا اپنی ذات میں خلیفۂ راشد ہونا اور ہے' جبکہ اس کے عہدِ خلافت کا خلافت راشدہ میں شامل ہونا اور ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنی ذات میں خلیفۂ راشد ہیں' خلافت راشدہ کے تمام معیارات ان کی ذات کی حد تک پورے ہیں' لیکن ان کا عہدِ حکومت اس معیار پر پورا نہیں اتر رہا۔ ایک تو اس عرصے میں افتراق رہا اور اس دَور میں عالمِ اسلام ایک وحدت نہیں رہا۔ دوسرے یہاں امن کی کیفیت نہیں تھی۔

آگے فرمایا: ﴿یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا ؕ﴾ ''وہ میری ہی بندگی کریں گے' میرے ساتھ کسی شے کو شریک نہیں کریں گے''۔ یہ بہت بڑی بڑی بشارتیں ہیں اور دورِ خلافت راشدہ کے چوبیس برس اس کا مصداقِ اَتم اور مصداقِ کامل ہیں۔ بعد میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ عمارت یک دم بالکل ہی زمین بوس ہوگئی ہو' بلکہ درجہ بدرجہ نیچے آئی ہے۔ لیکن ایک آئیڈیل اور ہر اعتبار سے دورِ نبوت کا عکسِ کامل یہ چوبیس یا ساڑھے چوبیس برس تھے۔ ﴿وَ مَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۵۵﴾﴾ ''اور جو اس کے بعد بھی کفر کرے گا تو وہی لوگ درحقیقت فاسق ہیں''۔ یہاں ''بَعۡدَ ذٰلِکَ'' سے کیا مراد ہے؟ یہ کہ اس وعدے کے بعد بھی! اللہ کا اتنا پختہ وعدہ' اللہ کی طرف سے اتنی مؤثق توثیق اور پھر بھی کوئی کفر کرے! اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب دین اس طرح غالب ہو چکا ہو اور امن قائم ہو چکا ہو' فتنہ باقی نہ رہے' اس کے بعد بھی اگر کوئی غلط راستے پر چلتا ہے تو وہ ثابت کر دیتا ہے کہ اس میں خیر کا کوئی عنصر ہے ہی نہیں۔

آخری آیت میں فرمایا: ﴿وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ......﴾ ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو......''۔ ہمارے آج کے درس کے خاتمے کے لیے یہ نہایت جامع اور نہایت موزوں الفاظ آگئے ہیں۔ یہاں سورۃ الحج کی آخری دو آیات ذہن میں تازہ کیجیے' جن میں ایمان کے منطقی تقاضے بیان کیے گئے ہیں: ﴿یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ارۡکَعُوۡا وَ اسۡجُدُوۡا وَ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمۡ وَ افۡعَلُوا الۡخَیۡرَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿ۚ۷۷﴾ وَ جَاہِدُوۡا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِہَادِہٖ ؕ ...... الخ﴾ دین کے عملی تقاضوں کی آخری سیڑھی جہاد فی سبیل اللہ ہے جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کا ''ذروۃ السنام'' قرار دیا ہے' لیکن عمل کے زینے کی پہلی سیڑھی فرائض دینی کی بجا آوری اور ارکانِ اسلام کی پابندی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے فرمایا: ''رکوع کرو اور سجدہ کرو''۔ پہلی سیڑھی پر قدم جماؤ گے تو دوسری پر چڑھنے کا امکان ہوگا۔ اگر یہیں پر قدم لرز رہے ہیں اور آپ کو استقامت حاصل نہیں تو اگلی کا کیا سوال؟ اسی لیے وہاں آخر میں پھر فرمایا: ﴿فَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ اعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰہِ ؕ ہُوَ مَوۡلٰىکُمۡ ۚ فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰی وَ نِعۡمَ النَّصِیۡرُ ﴿۷۸﴾﴾ ''پس قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ اور مضبوط پکڑو اللہ (کی رسی) کو' وہ تمہارا مالک ہے' سو خوب مالک ہے اور خوب مددگار''۔ یعنی اگر یہ سارا تصورِ دین سمجھ آ گیا اور تین منزلیں ذہن میں جم گئیں تو بسم اللہ کرو۔ کہاں سے کرو گے؟ قائم کرو نماز' ادا کرو زکوٰۃ! پہلی سیڑھی تو وہی ہوگی۔ ستون ڈالو گے تو چھت کا امکان ہے۔ پہلی منزل بنے گی تو دوسری کا امکان ہے اور دوسری بنے گی تو تیسری کا امکان ہے۔ لہٰذا وہاں (سورۃ الحج میں) جو ترتیب تھی وہی یہاں (سورۃ النور میں) ہے: ﴿وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۵۶﴾﴾ ''اور قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ اور اطاعت کرو رسولؐ کی تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔ واضح رہے کہ یہاں رسولؐ کی اطاعت صرف رسول کی حیثیت میں مراد نہیں ہے' بلکہ امیر کی حیثیت میں بھی' سپہ سالار کی حیثیت میں بھی' چیف ایگزیکٹو کی حیثیت میں بھی اور چیف جسٹس کی حیثیت میں بھی مراد ہے۔ چنانچہ آیتِ مبارکہ کے آخری الفاظ بہت معنی خیز ہیں: ﴿وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۵۶﴾﴾ ''اور رسولؐ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے!''

اللھم ربنا اجعلنا منھم' اللھم اغفرلنا وارحمنا واھدنا وعافنا وارزقنا' انت ولینا فی الدنیا والآخرۃ' توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین برحمتك یا ارحم الراحمین OO